© rasailojaraid.com

محمد اسحاق بھٹی

مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری

۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک کے تین سال بھی اپنی زندگی کے دلچسپ اور یادگار سال تھے۔ ان دنوں مولانا عطاء اللہ حنیف کو جو ۱۹۳۷ء میں مولانا محمد علی لکھوی کے ہاں جامعہ محمدیہ (مرکز اسلامیہ) میں پڑھاتے تھے' فیروز پور کی جماعت اہل حدیث کے سرکردہ ارکان مسجد گنبداں والی میں لے گئے تھے۔ فیروز پور شہر اور چھاؤنی میں اہل حدیث کی یہ ایک ہی مسجد تھی' اس سے قبل اس مسجد میں اس دور کے معروف اہل حدیث عالم مولانا عبد الکریم گرنتھی خطبہ جمع ارشاد تھے' وہ ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں "گھلو والہ" کے رہنے والے تھے اور مولانا سید داؤد غزنوی کے والد گرامی قدر حضرت الامام سید عبد الجبار غزنوی کے شاگرد اور مرید تھے۔ پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے اور مختلف موضوعات سے متعلق انہوں نے پنجابی نظم میں چھوٹی بڑی کئی کتابیں تصنیف کیں جو بہترین مواد پر مشتمل ہیں۔ سکھوں کی مذہبی کتاب جسے ان کے ہاں نہایت بابرکت اور پوتر سمجھا جاتا ہے' "گرنتھ صاحب" کے نام سے موسوم ہے' مولانا عبد الکریم اس پر اچھی نظر رکھتے تھے اور اس کے بہت سے اشلوک اور مندرجات انہیں یاد تھے' ان کی آواز بڑی رسیلی تھی' وہ گرنتھ صاحب کے اشلوک اور اس کے متعلق اپنے اشعار لہک لہک کر خوبصورت انداز میں سنایا کرتے تھے' سکھ ان کا بہت احترام کرتے تھے' گرنتھ صاحب کے عالم ہونے کی بنا پر انہیں "گرنتھی" کہا جاتا تھا۔

ان دنوں چھوٹے بڑے مختلف مقامات کی جماعتی انجمنوں میں مذہبی اور اصلاحی سالانہ جلسے منعقد کرانے کا عام رواج تھا' ہندو' مسلمان اور سکھ اکٹھے رہتے تھے' اس لیے اس قسم کے جلسوں میں اہل علم کی تقریریں سننے کے لئے بلا تفریق مذہب و ملت سب لوگ شامل ہوتے تھے' مولانا عبد الکریم کی تقریر میں دوسرے لوگوں کے علاوہ سکھ صاحبان کثرت سے شرکت کرتے تھے۔

خاندان غزنویہ سے قرب و تعلق کی بنا پر وہ اپنے نام کے ساتھ "امین خاندان غزنویہ" تحریر فرمایا کرتے تھے۔ حضرت الامام سید عبد الجبار غزنوی کی وفات کے بعد انہوں نے پنجابی نظم میں ان کا جو مرثیہ لکھا وہ کتابی شکل میں "سوزش فراق" جھوک ہادی میرے عبد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الجباروی کے نام سے اشاعت پذیر ہوا: نہایت درد ناک اور دل دہلا دینے والا مرثیہ تھا۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو جو مولانا داؤد غزنوی سے متعلق ہے۔

دور داؤدی کجھ قابل تسلی اے
غزنی گھرانے دی ایہہ پونی تے چھلی اے
اہدی بدولت ہنر علم دی چلی اے
عمر دراز قومی خدمت گزار دی
جھوک ہادی میرے عبد الجبار دی۔

قیام پاکستان کے بعد ان کے بڑے بیٹے مولوی نصر اللہ کھڈیاں (ضلع قصور) میں اور چھوٹے لڑکے محمد یحییٰ شہر قصور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے' خود مولانا عبد الکریم نے بہاولنگر میں اقامت اختیار کر لی تھی' وہ بہاول نگر ہی میں ۱۴۔ اپریل ۱۹۶۱ء (۸ ذیقعدہ ۱۳۸۰ھ) کو فوت ہوئے۔ میرے نہایت مہربان اور مشفق تھے' کئی دفعہ لاہور تشریف لائے اور اس عاجز کے لئے دعائیں فرمائیں۔ ان شاء اللہ ان کے حالات کسی دوسری صحبت میں مستقل مضمون میں بیان کئے جائیں گے۔

کسی وجہ سے فیروز پور کی مسجد گنبداں والی کی خطابت سے وہ علیحدہ ہو گئے تو ان کی جگہ قاضی احمد اللہ صاحب یہ خدمت سرانجام دینے لگے تھے جو دراصل سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور فیروز پور کے رام سکھ داس (آر' ایس' ڈی) کالج میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ لیکن یہ معاملہ عارضی تھا اور وہاں مستقل طور پر ایسے خطیب کی ضرورت تھی جو تدریس کے فرائض بھی سرانجام دے سکے۔ اس کے لیے ارکان انجمن کی نگاہ مولانا عطاء اللہ حنیف پر پڑی اور وہ انکو مرکز الاسلام سے فیروز پور لے گئے۔

اسی زمانے میں ضلع ہوشیار پور کے مولانا محمد شفیع صاحب کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں' مولانا محمد شفیع قیام پاکستان کے بعد سے صوبہ سندھ کے مقام خیر پور میرس میں آباد ہیں۔

فیروز پور کی انجمن اہل حدیث جن چند افراد پر مشتمل تھی وہ بڑے جاندار اور موثر تھے' ان میں ایک مولانا عبید اللہ احرار تھے جو سیاسی نقطہ نظر کے اعتبار سے مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے اور بہت اچھے مقرر تھے' بحث و مباحثہ میں بڑے تیز تھے اور آسانی سے کسی کی گرفت میں نہیں آتے تھے۔ خان عبد العظیم خاں حاجی نظام الدین اور مہر محمد علی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی مجلس احرار سے منسلک تھے لیکن یہ حضرات کچھ اور طبیعت کے تھے۔ میاں محمد یعقوب ایڈووکیٹ (جو آج کل فیصل آباد میں مقیم ہیں) اور میاں محمد سعید (جنہوں نے آزادی کے بعد عین عالم جوانی میں ملتان میں وفات پائی) مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔ سیاسی اختلاف کے باوجود ان تمام حضرات کے باہم بڑے دوستانہ مراسم تھے اور انجمن کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے تھے۔

میں اس عہد میں وہاں ایک معمولی طالب علم تھا' یہ تمام حضرات مجھ پر شفقت فرماتے تھے' ان میں میاں محمد یعقوب اس دنیا میں موجود ہیں' اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے' ان سے کبھی ملاقات ہوتی ہے تو بڑی محبت سے پیش آتے ہیں۔

مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد شفیع وہاں خطابت اور درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ان سے انجمن کے تمام ارکان عزت و احترام کا برتاؤ کرتے تھے' بعض حضرات کی ان سے بے تکلفانہ دوستی قائم ہو گئی تھی۔

مولانا عبید اللہ احرار کو ناموں کا ترجمہ کرنے اور مسمّٰی کی عادات و اطوار' نفسیات اور اس کے اسلوب کلام کے مطابق اس کا نام بگاڑنے میں بڑی مہارت حاصل تھی' اس باب میں وہ کسی کو معاف نہیں کرتے تھے' خود اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے تھے' چنانچہ اپنے نام کا ترجمہ انہوں نے "چھوٹو رام" کیا تھا' مولانا عطاء اللہ کو وہ "رام دتا" کہا کرتے تھے' اسی طرح انہوں نے مولانا محمد شفیع کا بھی ایک نام رکھا تھا جو ان کی شخصیت کے عین ہم آہنگ تھا' جسے "طابق النعل بالنعل" سے تعبیر کرنا چاہئے' افسوس ہے ترپین چون سال قبل کا یہ نام اب ذہن میں نہیں رہا۔

انہی دنوں ایک نوجوان وہاں آئے جن کے قد کو ہم میانہ قد نہیں کہہ سکتے' میانے سے قدرے چھوٹا' دبلے پتلے' گورا اور نکھرا ہوا رنگ' تیکھے نقوش' موٹی موٹی چمکتی ہوئی آنکھیں' چھوٹی چھوٹی داڑھی' باریک سے ہونٹ' اس دور کے رواج کے مطابق تہمند اور قمیص پہنے ہوئے' سر پر نیلی سی دھاری کا عمامہ جسے اس زمانے میں لنگی کہا جاتا تھا۔ اب اس "لنگی" کا چلن باقی نہ رہا ـــــ پتا چلا کہ ان کا اسم گرامی مولانا ثناء اللہ ہے اور مولانا محمد شفیع صاحب کے بھتیجے ہیں' یہاں یہ طلبہ کو پڑھایا کریں گے۔

دوسرے دن دیکھا تو واقعی وہ مسند درس پر بیٹھے تھے۔ وضع قطع اور قدوقامت کے اعتبار سے وہ خود طالب علم معلوم ہوتے تھے' مگر استاد کی مسند پر تشریف فرما تھے۔ استاد کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطلب یہ نہیں کہ جس کے متعلق لفظ بولا جائے وہ طالب علم نہیں رہتا' طالب علم تو وہ مہد سے لحد تک رہتا ہے اور اس کا اسے شرعاً مکلف بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ اس اثناء میں اگرچہ وہ استاذ الاساتذہ ہو جائے' مگر طالب علمی کے دائرے سے ہرگز باہر نہیں نکل سکتا۔ اس کا اصل کمال یہی ہے اور صحیح معنوں میں "استادی" اسی کا نام ہے کہ وہ طالب علم کے لئے ہر وقت آمادہ و تیار رہے اور جہاں سے علم حاصل ہو سکے اور جس طریق سے حاصل ہو سکے' اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے' یہی مطلب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا

الکلمتہ الحکمتہ ضالتہ الحکیم فحیث وجدھا فھو احق بھا

اب ہم ان کے حضور شاگرد کی حیثیت سے دو زانو ہو کر بیٹھے تھے۔ میں اس وقت کتب حدیث میں سے ابوداؤد اور ترمذی' تفسیر قرآن میں جامع البیان' فقہ کی شرح وقایہ' اصول فقہ کی نور الانوار اصول حدیث کی مقدمہ ابن الصلاح' معانی و بیان کی مطول' عربی ادب کی مقامات حریری' علم نحو کی کتاب کافیہ' صرف کی شافیہ اور منطق کی شرح تہذیب پڑھتا تھا۔ علاوہ ازیں اس دور کے نصاب کی کچھ اور کتابیں بھی تھیں۔ حدیث اور تفسیر کی کتابیں تو مولانا عطاء اللہ صاحب پڑھاتے تھے' مولانا محمد شفیع صاحب کے بارے میں یاد نہیں کہ وہ کون کونسی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ یوں بھی وہ کم ہی پڑھاتے تھے' زیادہ تر ان کا رجحان انتظامی امور کی طرف تھا۔

مولانا محمد شفیع مسجد ہی کے ساتھ ایک مکان میں رہتے تھے اور مولانا عطاء اللہ صاحب تھوڑے فاصلے پر باولی رام دیال میں (اندرون امرتسری دروازہ) ایک کرائے کے مکان میں اقامت گزیں تھے' اس محلے میں مسلمان' سکھ اور ہندو اکٹھے رہتے تھے اور آپس میں سب کا بڑا اتفاق تھا۔ مولانا عطاء اللہ صاحب تمام اہل محلہ کے نزدیک مکرم و محترم رہے۔ مولانا کا مکان کا کرایہ مجھے یاد ہے ماہانہ پانچ روپے تھا' جب کہ ان کا پچیس روپے ماہانہ تھا۔ ان حالات کی روشنی میں یہ بڑی معقول تنخواہ تھی' مکان کا کرایہ بھی کم نہیں تھا۔

اس دور میں جو کتابیں مدارس میں طلباء کو پڑھائی جاتی تھیں' اب تو میرا خیال ہے ان کتابوں میں سے بہت سی کتابوں کے شاید نام بھی بعض طالب علموں کو معلوم نہیں ہونگے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ حدیث کی کتابیں کسی نہ کسی شکل میں پوری پڑھائی جاتی ہیں' ورنہ فنون کی اکثر کتابوں کے اردو ترجمے پر ہی گزارا کیا جا رہا ہے۔ فقہ کی تو ہم نے اللہ کے فضل سے اس شدت سے مخالفت کی ہے کہ اسے اب نصاب سے تقریباً دیس نکالا دے دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گیا ہے۔ باقی بہت سے فنون نہ بعض مدارس کے استاد پڑھا سکتے ہیں نہ شاگرد پڑھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ عام مدارس میں بودے نصاب پر بودا کام چل رہا ہے اور جو لڑکے خیر سے "فارغ التحصیل" ہو کر نکل رہے ہیں، ان میں سے بعض تو صحیح تلفظ سے قرآن بھی نہیں پڑھ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مدارس کے ارباب انتظام اور اصحاب تدریس اپنی اولاد کو اس طرف نہیں لا رہے ہیں، وہ اپنی اولادوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے منافع بخش علوم پڑھاتے ہیں اور مدرسوں کی دکانداری قائم رکھنے کے لئے دوسروں کے بچوں کو نکمے بنا رہے ہیں۔ اس کا نام دین کی خدمت رکھا گیا ہے اور جس سے اپنے بچوں کو محروم کر دیا گیا ہے یا نرم لفظوں میں یوں کہئے کہ مستثنیٰ فرما دیا گیا ہے۔ دیوبندیوں کے مدارس میں البتہ تمام علوم ہماری نسبت بہتر طریقے سے پڑھائے جاتے ہیں۔

بات کہاں سے کہاں چلی گئی، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میری یادداشت کے مطابق مندرجہ ذیل طلباء مولانا ثناء اللہ صاحب کے حلقہ درس میں شامل تھے۔

۱۔ سید عبید اللہ شاہ بن عبد الرحیم شاہ سکنہ مکھو، تحصیل زیرہ، ضلع فیروز پور۔ یہ وفات پا چکے ہیں۔

۲۔ محمد ابراہیم، سکنہ فتوحی والا، نزد گنڈا سنگھ والا، ضلع قصور۔ یہ اب اپنے گاؤں (فتوحی والا) کے سرکاری سکول میں ٹیچر ہیں۔

۳۔ محمد جابر، ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔

۴۔ حافظ علی محمد، یہ میرے شہر کوٹ کپورہ کے رہنے والے تھے، اب ہمارے موجودہ گاؤں (چک نمبر ۵۳ گ ب تحصیل جڑانوالہ، ضلع فیصل آباد) میں امام مسجد ہیں۔

۵۔ محمد سلیمان انصاری، یہ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے بھانجے ہوتے ہیں اور اس وقت ہفت روزہ "الاعتصام" کے مدیر انتظامی ہیں۔

۶۔ عبد الرحمٰن، یہ مولانا عطاء اللہ صاحب کے گاؤں بھوجیاں کے رہنے والے تھے۔

۷۔ یہ فقیر راقم السطور۔

ماسٹر ابراہیم اس وقت بھی بہت باتیں کرتے تھے، یعنی بہت بڑے "قوال" تھے، اب بھی کہیں ملاقات ہو جائے تو ماضی بعید کی طرح باتیں کرتے ہیں اور پھر یادداشتوں کی بہت سی گرہیں تیزی سے کھلنے لگتی ہیں۔ بڑا دلچسپ اور خوش مزاج آدمی ہے۔ ماشاء اللہ پوتوں اور نواسوں والا ہو گیا ہے، لیکن طرز کلام اور اسلوب گفتگو وہی ہے جو بچپن میں تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا ثناء اللہ کی یہ اٹھتی جوانی کا دور تھا' دیہات کی کھلی فضاؤں میں انہوں نے پرورش پائی تھی' بڑے زندہ دل اور نہایت خوش مزاج عالم تھے۔ نصابی کتابیں محنت اور سمجھ سوچ کے ساتھ لائق فائق اساتذہ سے پڑھی تھیں۔ میں نے ان سے منطق کی دو کتابیں شرح تہذیب اور قطبی پڑھیں' کافیہ اور شافیہ کا اکثر حصہ ان سے پڑھا' مقامات حریری کے چند مقامے ان سے پڑھنے کا موقع ملا' شرح وقایہ کے بہت سے ابواب ان سے پڑھے۔ وہ نہایت محنت' محبت اور شوق کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ ان کی زبان خالص ہوشیار پوری تھی' جس میں "اینڈا اونڈا' کنڈا" وغیرہ کا عنصر غالب تھا۔

تدریس کے ابتدائی دور میں بھی ان میں روانی تھی' صاف ستھرے اسلوب میں مسئلہ زیر بحث کی وضاحت کرتے اور ایسے انداز سے بات کو آگے بڑھاتے کہ اس کا ہر گوشہ اور ہر حصہ آسانی سے ذہن میں اترتا جاتا۔ ایسے قابل' ماہر دینیات' دیانت دار اور محنتی اساتذہ اب کہاں پیدا ہونگے۔

وہ ہر چھوٹی بڑی کتاب کا مطالعہ کر کے آتے اور پوری تیاری سے مسند تدریس پر بیٹھتے تھے' ان کی زبان میں بڑی مٹھاس اور ملائمت تھی' پھر اس میں مزاح اور خوش طبعی کے اجزاء بھی مناسب مقدار میں پائے جاتے تھے۔ ان میں کمال یہ تھا کہ درس کے وقت نہ خود اکتاتے تھے نہ طالب علم کو اکتا جانے کا موقع دیتے تھے۔ دھیمے لہجے اور میٹھی زبان میں سلسلہ کلام کو جاری رکھتے تھے۔ سچی بات ہے مجھے ان کے پیار بھرے اور ماہرانہ طریق تعلیم سے بہت فائدہ پہنچا۔

میں نے زندگی کے سفر کا آغاز طالب علمی سے کیا اور ہمیشہ طالب علم رہا کہ اس میں جو لطف پنہاں ہے' وہ کہیں نہیں۔ اس میں انسان کو ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ اس کی معلومات میں نقص کہاں ہے اور اسے کیا چیز سیکھنی اور حاصل کرنی چاہیے۔ یہ ان پرانے اساتذہ کا فیضان اور ان کی تربیت کا اثر ہے کہ طبیعت حصول علم کا تقاضا کرتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ میں تدریس سے رابطہ قائم نہ رکھ سکا کہ اس سے ذہن میں معلم کے بجائے متعلم کا احساس ابھرتا ہے' ورنہ اپنے عالی مرتبت اساتذہ سے حاصل کی ہوئیں بہت سی معلومات بفضل خدا اب بھی حافظے میں موجود ہیں اور میں انہیں اپنے لئے ایک قیمتی متاع سمجھتا ہوں۔ وقت کی رفتار نے تدریس کی بجائے اگرچہ رخ قلم و قرطاس کی طرف موڑ دیا لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ طویل زمانہ گزر جانے کے باوجود اس دور کی محفلیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ان کی عملی و فنی گفتگوئیں سرمایہ زندگی کی حیثیت رکھتی ہیں' پھر ان کے الگ الگ طریقہ ہائے تعلیم کی دل آویز ادائیں نہاں خانہ ذہن میں اپنی مضبوط جگہ بنائے ہوئے ہیں۔

اگر حالات نے اجازت دی تو ان شاء اللہ اپنے تمام اساتذہ کرام کا الگ الگ مضامین میں ذکر کروں گا' آج کی صحبت صرف حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب کے لئے مخصوص ہے اور اس میں "شرکت غیر" نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس شخص کے ذہن میں اپنے بزرگوں کی کچھ باتیں موجود ہیں' اسے جان لینا چاہئے کہ اس کے پاس کچھ موجود ہے اور اس کے قلب کی دنیا پوری طرح آباد ہے اور ہمیشہ آباد رہے گی' اس میں کبھی ویرانی نہیں آئے گی' دولت خاں قاتشال سمرقندی کا شعر کہاں یاد آیا ہے۔

از صد سخن پیرم یک حرف مرا یاد است
عالم نہ شود ویراں تا میکدہ آباد است

یعنی مجھے اپنے مرشد کی سینکڑوں باتوں میں سے فقط یہی ایک بات یاد ہے کہ یہ دنیا اس وقت تک برباد نہیں ہو گی جب تک مے خانے کی رونقیں قائم ہیں۔

ہمیں بزرگوں نے یہی بتایا ہے کہ ماں باپ اور استاد میں کوئی فرق نہیں ہے' جو شخص استاد کو یاد نہیں رکھتا' وہ ماں باپ کا بھی اطاعت گزار نہیں ہو سکتا۔ دونوں کا مرتبہ مساوی ہے۔

بہرحال بات مولانا ثناء اللہ صاحب کی ہو رہی تھی' وہ عالم شباب میں بھی بڑے حلیم الطبع' منکسر المزاج اور متواضع تھے۔ لوگوں سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے تھے' صرف پڑھنا پڑھانا اور طلباء سے رابطہ رکھنا ان کا کام تھا۔

اس زمانے میں ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ اخبار باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور درسی کتابوں کے علاوہ عربی اور اردو کی دیگر کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رکھتے تھے۔

مولانا محمد شفیع اور مولانا عطاء اللہ صاحب عمر میں ان سے بہت بڑے تھے' یہ ان دونوں حضرات کا بے حد احترام کرتے تھے' اونچی نظر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھتے تھے' وہ جو کچھ کہتے فواد کی حیثیت سے ان کی بات سنتے اور اس پر عمل کرتے۔ اللہ نے ایک صفت ان میں یہ ودیعت فرمائی تھی کہ نیک اور متدین تھے یعنی عالم باعمل۔ "در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری" والا معاملہ تھا۔

مولانا ثناء اللہ میں ایک بہت اچھی بات یہ تھی کہ وعظ و تقریر سے بالکل دلچسپی نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھتے تھے، میں نے کبھی ان کو تقریر کرتے یا وعظ کہتے نہیں سنا۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی بیماری ہے، جس سے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا، ورنہ وہ "مقررہ شعلہ بیان، واعظ شیریں کلام، خطیب ملت اور مناظر اسلام" تو بے شک ہو جاتے لیکن علم اور عمل سے انہیں کوئی تعلق نہ رہتا۔

معصوم سی شکل کے یہ عالم و مدرس بڑے کھلے دل کے مالک تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ابراہیم کو تھوڑے بہت پیسے دیتے اور کھانے پینے کی کوئی چیز اس سے منگواتے اور پھر خود بھی کھاتے اور ہمیں بھی کھلاتے۔

یہ وہ مولانا ثناء اللہ صاحب ہیں جن سے میں نے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک بعض درسی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۱ء آیا تو میں گوجرانوالہ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور دو سال میں ان سے درس نظامیہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ پھر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ درس و تدریس کے دائرے سے بالکل باہر نکل گیا۔ دلی، آگرہ، گوالیار، دھول پور، فتح پور سیکری، الہ آباد، کان پور، میرٹھ وغیرہ شہروں میں گھومتا پھرتا رہا، رات کہیں، دن کہیں۔ اس دور میں ہم نے ہندوستان کا تقریباً ہر شہر دیکھ ڈالا، بعض شہروں کے علمائے کرام سے ملاقاتوں کا موقع ملا۔ قصہ مختصر یہ کہ اٹھارہ انیس برس کی عمر تک ہم نے خوب آوارہ گردی کی اور خوب گھومے پھرے۔

۱۹۴۳ء میں مولانا معین الدین لکھوی کے مرکز اسلام میں چلے گئے، وہاں ایک خاص درجے کا تدریسی سلسلہ جاری تھا جو اپنے مزاج کے عین مطابق تھا۔ جون ۱۹۴۷ء تک وہاں رہا۔ اس اثناء میں مولانا ثناء اللہ صاحب یاد آتے رہے اور ان کا طریق تدریس ذہن میں گردش کرتا رہا، لیکن کچھ پتا نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

اس دور میں (۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک) ہم نے سیاست بازی بھی کی اور قید بھی ہوئے۔ ریاست کا قید خانہ، تنہائی کی قید، نہ کسی سے ملنے کی اجازت نہ کچھ لکھنے پڑھنے کی سہولت ــــــ! صرف ماضی کی یادیں تھیں، جن کے دوش پر سوار ہو کر شب و روز کا کارواں ایک خاص رفتار کے ساتھ چلتا رہتا تھا۔ اس وقت ہم عمر کی بیسویں منزل سے آگے نکل چکے تھے۔ قید خانے کی تنہائیوں میں جو کرم فرما بہت یاد آئے، ان میں ہمارے ممدوح استاد مولانا ثناء اللہ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہم ضلع لائل پور کی تحصیل جڑانوالہ کے ایک گاؤں میں آ بسے۔ فسادات کے اس زبردست ریلے اور پر آشوب دور میں عہد گزشتہ کے تمام متعلقین و احباب کا خیال سطح ذہن پر نمایاں رہا۔ مولانا ثناء اللہ ہمارے محسن تھے' بار بار خیال آتا تھا کہ معلوم نہیں' ان کے ساتھ کیا گزری' مولانا محمد شفیع بھی بہت یاد آئے۔

آزادی سے کم و بیش سوا سال بعد میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے لاہور آیا تو مولانا عطاء اللہ صاحب سے پتا چلا کہ مولانا محمد شفیع صاحب سندھ کے کسی مقام پر چلے گئے ہیں' اتفاقاً وہ انہی دنوں لاہور تشریف لائے تو انہیں دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی اور پھر انہی سے معلوم ہوا کہ مولانا ثناء اللہ صاحب اللہ کے فضل سے بخیریت ہیں۔ انہوں نے ان کے جائے مقام کے متعلق بھی بتایا تھا' لیکن اب یہ بات ذہن میں نہیں کہ وہ جگہ کون سی تھی' جس کا مولانا محمد شفیع نے ذکر فرمایا تھا۔

اگست ۱۹۴۹ء میں ہفت روزہ "الاعتصام" جاری ہوا تو مرکزی جمعیت کے فیصلے کے مطابق مجھے اس کا معاون ایڈیٹر بنایا گیا اور پھر کچھ عرصے بعد اس کی ادارتی ذمہ داریاں میرے سپرد کر دی گئیں' میں کم و بیش پندرہ سال (۳۰۔ مئی ۱۹۶۵ء تک) یہ خدمت سر انجام دیتا رہا' اس اثناء میں بے شمار علماء و زعما سے ملاقات کے مواقع میسر آئے' بہت سے حضرات سے تعلقات استوار ہوئے لیکن اپنے استاد محترم مولانا ثناء اللہ صاحب کو سلام کرنے کے موقع نہ ملا۔ شاید وہ اس دوران میں لاہور بھی تشریف نہیں لا سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے مداحوں اور شاگردوں کو بھول گئے تھے' اصل معاملہ یہ ہے کہ وہ کہیں آنے جانے اور چل پھر کر میلہ دیکھنے کے عادی نہیں تھے' ابتدا ہی سے وہ طبع خلوت پسند رکھتے ہیں۔ جلوت سے ان کی طبیعت آشنا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ عام علماء کی طرح مجلس آرائی ان کا شیوہ نہیں' وہ صرف تعلیم و تعلم اور درس و تدریس سے علم رکھتے ہیں اور اسی شغل میں خوش رہتے ہیں۔

وقت گزرتا گیا اور مستقبل' ماضی قریب کے قالب میں ڈھل ڈھل کر ماضی بعید میں تحلیل ہوتا گیا' ایک دن جامعہ سلفیہ کے لائبریرین عزیزی محمد اشرف جاوید میرے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے' وہ لائبریری کے لئے کچھ کتابیں خریدنا چاہتے تھے۔ ان سے باتوں کا سلسلہ چل پڑے تو بہت سے موضوعات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری جامعہ سلفیہ میں فرائض تدریس انجام دے رہے ہیں۔ سن کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہایت مسرت ہوئی' میں نے ان کا حلیہ بیان کیا تو کہا بالکل وہی۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ازراہ کرم وہ مجھے بھولے نہیں۔

میں فیصل آباد کو جانے اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر انہیں سلام عرض کرنے کا پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ اس اثناء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر سے خط موصول ہوا کہ فلاں تاریخ کو جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں مرکزی جمعیت کی ایک میٹنگ ہو رہی ہے' جس میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔

مقررہ تاریخ کو وہاں گیا تو حسب معمول بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی اس قسم کی میٹنگوں کا کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو ہمارے لیے اصل فائدہ یہی ہوتا ہے کہ مختلف مقامات سے آئے ہوئے پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

جی چاہتا تھا اور اس کے لئے بڑا بے تاب تھا کہ مولانا ثناء اللہ صاحب کو سلام عرض کروں۔ میٹنگ ہال سے باہر نکل کر تھوڑا سا آگے بڑھا تو دیکھا کہ منحنی سے جسم کے ایک صاحب برآمدے میں چارپائی پر تنہا بیٹھے ہیں۔ شلوار قمیص میں ملبوس' آنکھوں پر نظر کی عینک' سفید پتلی سی داڑھی' تیکھے نقوش۔ یقین ہو گیا کہ یہی وہ مولانا ثناء اللہ ہیں' جن کی میں تلاش میں ہوں۔ یہ تقریباً آٹھ سال پہلے کی بات ہے' میں انہیں کم و بیش پینتالیس برس کے بعد دیکھ رہا تھا' چہرے کے خدو خال اور نقش و نگار بالکل وہی تھے جو عالم جوانی میں تھے' بالوں کی سیاہی البتہ سفیدی میں بدل گئی تھی' تہمند کی جگہ شلوار نے لے لی تھی اور آنکھوں پر عینک کے شیشوں نے سایہ کر رکھا تھا۔

میں نے ان کی پائنتی میں بیٹھ کر السلام علیکم کہا اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دیتے ہوئے عرض کیا:

"آپ کا دیرینہ شاگرد اسحاق بھٹی۔"

یہ الفاظ سن کر انھوں نے گردن میری طرف گھمائی اور عینک کے شیشوں کی اوٹ سے دیکھتے ہوئے فرمایا:

"اچھا آپ۔"

اتنے میں اشرف جاوید بھی آ گئے۔ چند منٹ باتیں ہوئیں اور میں چلا گیا۔ اس کے بعد ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ البتہ اشرف جاوید کی وساطت سے ان کی خیرو عافیت کا علم ہوتا رہتا ہے۔

پیدا کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس' تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبد الرشید عراقی

موطا امام مالکؒ

© rasailojaraid.com

موطا امام مالک حدیث کی پہلی کتاب ہے جو کتب خانہ اسلام میں احاطہ تحریر میں لائی گئی۔ اس کی مقبولیت و شہرت کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کو شارحین اور معلقین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئی۔ کئی علمائے کرام نے اس کی طویل شرح لکھی، بعض نے متوسط اور بعض نے مختصر، کئی علمائے کرام نے اس کی تجرید کی۔ کئی ایک علمائے کرام نے اس کے رجال پر بحث کی اور کئی ایک علمائے کرام نے اس کے رواۃ کو موضوع بحث بنایا۔ بلاد اسلامیہ کے کئی ایک نامور محدثین کرام نے اس کی شروحات لکھیں جن میں علامہ ابن حبیب مالکی (م ۲۳۹/ ۸۵۳ء) امام ابو سلمان خطابی (م ۳۸۸ھ/ ۹۹۸ء) علامہ ابن رشیق قروانی (م ۴۵۶ / ۱۰۶۴ء) علامہ ابن عبد البر قرطبی (م ۴۶۳/ ۱۰۷۱ء) قاضی عیاض مالکی (م ۵۴۴ / ۱۱۴۹ء) قاضی ابوبکر بن العربی (م ۵۴۶/ ۱۱۵۱ء) علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء) اور علامہ زرقانی مصری (م ۱۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء) شامل ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں علمائے کرام نے موطا امام مالک سے متعلق جو علمی خدمات انجام دی ہیں۔ اس مقالہ میں ان کا مختصر تعارف پیش کرنا ہے۔ ان میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) شیخ سلام اللہ (۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء) مولانا محمد زکریا سہارن پوری (م ۱۴۰۲/ ۱۹۸۲ء) مولانا شیخ عبد الوہاب آف علی خان دہلی (۱۳۶۳/ ۱۹۴۴ء) اور مولانا وحید الزماں حیدر آبادی (م ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) شامل ہیں

© rasailojaraid.com